تحریک پاکستان، علامہ اقبال اور قائداعظم

انعام الحق کوثر

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو نقشہ عالم پر ایک نیا ملک نمودار ہوا۔ تاریخ کی آنکھوں نے یہ تو بارہا دیکھا تھا کہ ایک قوم جاندار اور صحت مند نظریئے کے بل پر بنی اور جب اس نظریئے کے علمبرداروں نے نبض وقت کو نہ پہچانا اور حالات کے ساتھ ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ یا تو وہ قوم بگڑ گئی، اوج ترقی سے اعماق ذلت میں گر گئی۔ پھر زمانے کی چکی میں پس کر یہی قوم ایک نئے نظریہ حیات اور بلند مقصد کے سہارے اٹھی۔ پانچ ہزار سال قبل از مسیح سے قوموں کا یہ صعود و ہبوط جاری ہے اور شاید ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ تاریخ کی نظروں نے یہ بھی دیکھا کہ چند منچلے انسان سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے انجان سرزمینوں میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنی روایات ماضیہ، قوت ارادی اور کرشمۂ خرد سے تہذیب و تمدن کے لاتعداد فانوس روشن کر دئے۔ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور سمندروں میں ابھرے ہوئے بے شمار ننھے منے جزیرے ہیں، جنہیں انسانی تہذیب کے احاطہ میں لایا گیا ہے اور تمدن آدم کی شعاعوں نے انہیں منور کیا ہے۔

لیکن اس نئے ملک کا وجود خود تاریخ کے لیے ایک انوکھا تجربہ اور ایک اچھوتا مشاہدہ تھا۔ ایک ایسا ملک جو جغرافیائی دریافت بھی تھا اور تاریخی بھی۔ ایک ایسا ملک جس میں ایک قوم بستی تھی، لیکن وہ دو حصوں میں منقسم تھا جس کا درمیانی فاصلہ کم و بیش دو ہزار میل کے قریب تھا۔ ایک ایسا ملک تھا جس کے دونوں حصے ایک ہی تڑپ اور ایک ہی مقصد سے بیتاب اور سرشار تھے۔ لیکن ہر حصے کی آب و ہوا اور بود و باش بہت مختلف تھی۔ اس ملک کے قیام پر یقیناً ایک دنیا محو حیرت تھی۔

بہرحال ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ نیا ملک۔ پاکستان۔ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ یہ ایک کھلا ہوا راز تھا کہ اس ملک اور اس ملک میں بسنے والی قوم کے سیاسی خالق قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ وہی اس ملک کے پہلے گورنر جنرل ہوئے۔ اس ملک کی پیدائش سے ذرا قبل اور پیدائش کے فوراً بعد انسانیت سے جو دردناک ہولی کھیلی گئی اور انسانوں کو جس ہولناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا وہ بھی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو ملک کا ناخدا گھبرایا اور نہ ہی یہاں کی قوم نے دل چھوڑا۔ لوگ گرتے پڑتے اور مرتے رہے لیکن ان کے تھرتھراتے ہوئے لبوں سے ایک ہی لفظ برآمد ہوتا رہا۔ پاکستان۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کی روح، ان کا ضمیر، ان کی تاریخ، ان کے قلب و

نظر، ان کی قوت کار اور ان کا ذوق تخلیق پگھل پگھل کر اس جہاں خیز لفظ میں سما گیا تھا۔ ایسا کیوں کر ہوا؟ - یہ ایک طویل کہانی ہے اور اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو ہمیں اس لفظ کا پس منظر وسیع تر نظر آئے گا۔ جب یہ پردہ اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قائداعظم ایک فرد نہیں تھے۔ حیاتیات کی رو سے ہر انسان صدیوں کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ بالکل ایسے ہی تاریخی لحاظ سے ہر تحریک صدیوں کی پیداوار ہے اور قائداعظم اصل میں بہت سے افراد کا مجموعہ تھے۔ وہ ہزاروں افراد ماضیہ اور روایات گذشتہ کے کندھوں پر کھڑے تھے۔ بلکہ ان کا سیاسی ظہور تھے۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جیسے کڑک سے پہلے بجلی کا اشکارا ضروری ہے۔ بالکل ایسے ہی تخلیق سے پہلے تخیل اور تصور ضروری ہے۔ انقلاب فرانس کی خون آشامی کے لیے والٹیر کا ہمہ سوز فلسفہ درکار ہے اور اسی انقلاب کی جمہوریت پسندی کے لیے روسو کا وسیع تر نظریہ انسانیت چاہیے۔ تحریک اصلاح مذہب کے لیے تحریک احیائے علوم کی ضرورت ہے۔ انقلاب روس کے لیے میکسم گورکی، ٹالسٹائی اور پشکن پہلے آتے ہیں اور پھر لینن اور سٹالن پیدا ہوتے ہیں اور قائداعظم اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ وہ علامہ اقبال کے ذہنی پیرو تھے۔ تاریخ میں پاکستان کا پہلا ذکر انہوں نے کیا۔ علامہ اقبال تین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ والٹیر کی طرح ہمہ سوز اور روسو کی طرح جذباتی نہیں تھے۔ یہ تین صلاحیتیں ان کے خیالات کی دنیا میں ہر وقت موجود تھیں۔

۱۔ قوت تنقید ۲۔ قوت تجدید ۳۔ قوت تخلیق

ان تینوں کے جسمانی مجموعہ کا نام تھا اقبال، قوت تنقید ان کے وسیع مطالعہ، مشاہدۂ حقائق اور ژرف نگاہی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ وہ موجودہ تہذیب، ہندوستانی سماج اور موجودہ مسلمانوں کے مصائب کے نقاد بنے۔ خواہ وہ یورپ کے استعمار پسند ہوں خواہ وہ قدامت پسند طبقہ ہو اور خواہ روشنی یافتہ طبقہ وہ کسی کو نہیں بخشتے تھے اور چھان بین کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ان کی قوت تجدید کا انحصار اصل میں ان کی قوت تنقید پر ہی تھا۔ کیونکہ جہاں وہ معاشرہ اور معاشرتی نظام کے مصائب کو دیکھتے تھے وہیں اس کے محاسن کو نظر انداز بھی نہیں کرتے تھے مثلاً وہ اگر یورپ کی تاجرانہ وظالمانہ ذہنیت اور اس کی لوٹ کھسوٹ کے سخت خلاف تھے تو دوسری طرف وہ اس کی ندرت فکر وعمل، اس کی تسخیر فطرت، اس کے ذوق حیات اور اس کی مصروفیات کے قائل بھی تھے۔ ان کے خیال میں موجودہ دور کے بعض طبقوں نے مسلمان ذہن کے دروازے بند کر دیئے تھے لیکن وہ تاریخ اسلامیہ کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں پر مسلسل نظر رکھتے تھے۔ حضور پاک سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت تو تھی ہی، خلافت زادہ، عمر بن عبدالعزیز، ہارون الرشید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمود غزنوی، اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان وغیرہ سے وہ بہت متاثر تھے۔ چنانچہ وہ مسلسل اپنے قارئین کو ان ادوار گذشتہ اور ان کی روح رواں اقدار زندہ و پائندہ کی طرف کھینچتے تھے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

لیکن ان کی یہ تجدید اصل میں ایک نئی تخلیق کے لیے رہنما تھی۔ وہ اندھی تجدید کے قائل نہیں تھے بلکہ تہذیب کو رواں دواں اور ترقی پذیر سمجھتے تھے اس لیے وہ یورپ سے بہت سی باتیں سیکھ لینا چاہتے تھے۔

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

وہ مستقل ایک جہان نو کا تصور اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔

پرانے ہیں یہ ستارے زمیں بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز

اس نوخیز جہاں کو وہ روایت ماضیہ، تقاضائے وقت اور ذوق تخلیق کے سہارے ایک مثالی جہان بنانا چاہتے تھے۔ ان کے اسی جذبہ تخلیق کا اظہار ان کی دسمبر ۱۹۳۰ء کی الہ آباد کی تقریر میں یوں ہوا:

> اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کریں۔ میں ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ ہندوستان اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان میں توازن قوت کے باعث امن و امان پیدا ہو سکے گا۔

پھر علامہ نے فرمایا: ''ایک سبق جو میں نے اسلام کی تاریخ سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ آڑے وقت میں ہمیشہ اسلام ہی نے مسلمانوں کے وجود کو قائم رکھا۔ اگر آج مسلمان اپنی نگاہیں اسلام ہی پر جما دیں اور اس کے زندگی بخشنے والے تخیل کا اثر قبول کر لیں تو ان کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور ان کا وجود تباہی و بربادی سے یقیناً محفوظ ہو جائے گا''۔

نتیجتاً ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور سامنے آئی۔ مگر خود علامہ اقبال بھی ایک ثمرہ تھے بہت سے افراد، بہت سے نظریات اور صدہا سال کی تاریخ کے۔ ان کے دماغ میں جو کشمکش تھی اور ان کے قلم سے جو کچھ نکلتا تھا وہ صدیوں کی تگ و تاز اور سوز و ساز کا نتیجہ تھا۔ پاکستان جس کا سیاسی ظہور قائداعظم تھے اور نظریاتی ظہور علامہ مرحوم و مغفور، درحقیقت

قرارداداوں اور تقریروں کا نتیجہ نہیں تھا۔ یہ تو اصل میں یہاں کے مسلمانوں کا سوز دروں تھا۔ اس کے سوتے بہت گہرے تھے اور اس کے منبعے بہت دور دراز واقع تھے۔ تحریک پاکستان صدہا سال کے کروڑوں انسانوں کی امنگ تھی اور اسی لیے یہ عوام میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔

ماضی کی طرف چلیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کم و بیش ایک ہزار سال تک رہی۔ اس دوران میں انہوں نے غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ اپنے بہترین حسن سلوک، مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا لیکن ہندوؤں کے دلوں سے کبھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات میں کمی واقع نہ ہوئی۔ وہ مسلمانوں کو ملیچھ اور ناپاک ہی سمجھتے رہے۔ اور یوں ایک ہزار سالہ دور حکومت کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی بعد قائم رہا۔

مسلمانوں کی آمد سے اس برعظیم نے اپنی زندگی کا نیا، تازہ اور پائیدار ورق الٹا تو ہندومت سطحی نظر آنے لگا اور اس کی باطنی خامیاں روز روشن کی طرح جھانکنے لگیں۔ ہندومت کے مقابلے پر اسلام ایک واضح اور داخلی طور پر مضبوط مذہب تھا (اور ہے) وہ ایک ضابطۂ حیات تھا جس نے ہر فرد کی زندگی اور سماج کے ارتقا اور حکومتوں کے قول و فعل کو متعین کر دیا۔ مساوات اور اخوت کے اصولوں نے اس میں اندرونی طور پر ایسی وقعت پیدا کر دی جو ہندومت کو ذات پات کی غیر انسانی تمیز نے حاصل نہ ہونے دی تھی۔ اسلام توحید پرستی کا بہت سختی سے قائل ہے۔ وہ مصر ہے کہ انسان صرف ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ وہ فطرت پرستی، بت پرستی اور مظاہر پرستی کا ان تھک مخالف ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب کچھ انسانی خودی کی نفی ہے۔ اس کے برعکس ہندومت حیوانات، مظاہر فطرت اور دیوتاؤں کا پرستار ہونے کے علاوہ ایک خدا کا پجاری ہوسکتا ہے اور خدا کی ہستی سے سراسر منکر بھی۔ ہندو تثلیث تین دیوتاؤں (برہما، وشنو اور شو) پر مشتمل ہے۔ ان دیوتاؤں کے اوتار اور ان کی مورتیاں ہندوؤں کو عزیز ترین رہیں۔ اسلام توحید کے معاملے میں کسی سمجھوتے کا قائل نہیں اور ہندومت لازماً بت گروبت پرست ہے۔

اسی توحید پرستی کی بنا پر مسلمانوں کی انفرادیت اور علیحدہ قومیت کو برقرار رکھنے کے لیے امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مجاہدانہ تگ و تاز سے کام لیا۔ بقول علامہ اقبال:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

امام ربانیؒ کے کام کو سرسید احمد خاں نے آگے بڑھایا اور کہا:

مجھے یقین ہوگیا ہے کہ مسلمان اور ہندو، یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک

نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا، جوں جوں وقت گذرتا جائے گا یہ مخالفت اور عداوت (جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہے) ان ہندوؤں کے سبب ابھرتی جائے گی جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں[۲]۔

علامہ اقبال نے بھی اسی سلسلہ میں سعی بلیغ فرمائی۔ جس کے نتیجہ میں جداگانہ قومیت کی بنیاد پر ایک علیحدہ مملکت کا تصور مسلمانوں کے لیے پیش کیا۔ اسی کے باعث آپ 'مفکر پاکستان' کہلائے۔ بعد ازاں آپ نے محمد علی جناح کے بارے میں فرمایا کہ وہی مسلمانوں کی مناسب انداز پر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ایک روز علامہ اقبال کے ہاں قائداعظم محمد علی جناح کی دیانت، امانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا آپ نے فرمایا کہ ''مسٹر جناح کو خدائے تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا وہ خوبی کیا ہے۔ آپ نے انگریزی میں کہا:

he is incorruptible and unpurchaseable.

(نہ تو وہ بدعنوان ہیں اور نہ ہی انہیں خریدا جا سکتا ہے)[۳]۔

علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کے حصول کی خاطر تیار بھی کیا۔ جس کا ثبوت قائداعظم کے نام آپ کے خطوط مہیا کرتے ہیں[۴]۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو آپ نے قائداعظم کو تحریر کیا کہ:

آپ بہت مصروف ہیں مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر نہ خیال کریں گے۔ اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ایک اہم اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

مسلم لیگ کی تنظیم نو، اسے عوامی جماعت بنانے کے لیے اس کے منشور اور پروگرام میں تبدیلی کی ضرورت، اس کا دوسری مسلم جماعتوں سے اتحاد و تعاون۔ آل انڈیا نیشنل کنونشن اور مسلم رابطہ عوام تحریک کے مناسب جواب کے لیے مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز، قانون ہند ۱۹۳۵ء اور کمیونل ایوارڈ کے بارے میں مسلم پالیسی، ہندو مسلم فسادات، جناح سکندر معاہدہ، مسئلہ فلسطین اور برصغیر پاک و ہند میں امن و امان کے قیام اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے

لیے ایک مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت اور اہمیت وغیرہ۔

قائداعظم کے الفاظ میں 'ان (علامہ اقبال) کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہندوستان کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا مظہر آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرارداد لاہور ہے جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے''[۵]۔

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ۲۴ مارچ کو قائداعظم نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سید مطلوب الحسن سے کہا[۶]:

> اگرچہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہ وہی کیا ہے جو ان کی خواہش تھی۔

قائداعظم نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو یوم اقبال کی ایک تقریب میں کہا تھا[۷]: مجھے اس امر کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے''۔

اس سے پیشتر قائداعظم نے ۱۹۴۰ء میں یوں فرمایا تھا: ''کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا کہ اسے جب شیکسپیئر اور دولت برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا[۸]،

۱۹۴۴ء میں یوم اقبال کے موقعہ پر قائداعظم نے علامہ اقبال کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا[۹]:

''اگرچہ آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کا غیر فانی کلام ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ ان کی شاعری جو کہ حسن بیان کے ساتھ حسن معانی کی بھی آئینہ دار ہے۔ اس عظیم شاعر کے دل و دماغ میں ان پنہاں جذبات، حسیات، اور افکار کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ جن کا سرچشمہ اسلام کی سرمدی تعلیم ہے۔ اقبال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور مخلص پیروکار تھے وہ اول و آخر مسلمان تھے اور اسلام کے صحیح مفسر تھے۔

اقبال محض ایک فلاسفر اور معلم ہی نہ تھے بلکہ وہ حوصلہ، عمل، استقامت اور خود اعتمادی کے پیکر بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر انہیں اللہ تعالیٰ پر لازوال ایمان و ایقان تھا۔ وہ اسلام کی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان

کی زندگی ایک شاعر کے بلند مقاصد کے ساتھ ایک عملی انسان کی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج تھی۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ سعی پیہم ان کے پیغام کا جز لاینفک ہے۔ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں اسلامیت کا نمونہ تھے۔

''میں پورے خلوص سے یوم اقبال کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔ اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے تاکہ ہم بالآخر پاکستان حاصل کر کے ان ہی اصولوں کو اپنی مکمل طور پر خودمختار اور آزاد مملکت میں جاری وساری کر سکیں''۔

یہ تھا مختصر سا تحریک پاکستان کا تجزیہ جو قائداعظم کے مجاہدانہ عمل اور ناقابل تسخیر جذبے سے پروان چڑھی اور جس میں علامہ اقبال کی گہری سوچ اور مومنانہ فراست کی چھاپ بالکل صاف دکھائی دیتی ہے۔ اب بھی فضاؤں میں علامہ اقبال کی آواز آ رہی ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

حوالہ جات

۱۔ جسٹس سردار محمد اقبال، **اقبال اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ**، لاہور، ۱۹۷۵ء، ۲۸، ۲۹ پر مندرج ہے: ''بنگلہ دیش کے قیام سے جو لوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ دوقومی نظریہ ختم ہو گیا ہے وہ میرے نزدیک سراسر غلطی پر ہیں۔ بنگلہ دیش کا ایک علیحدہ ریاست کے طور پر وجود میں آنا اور بھارت میں مدغم نہ ہونا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے۔ اگرچہ پاکستان کے دشمنوں نے اس کے خلاف سازش کر کے اس کے مشرقی حصے کو جارحیت سے الگ کر دیا ہے۔ تاہم دوقومی نظریہ آج بھی زندہ ہے''

۲۔ ایضاً، ۱۱

۳۔ غلام دستگیر رشید، **آثار اقبال**، ۴۱، ۴۲

۴۔ **اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام**، ترجمہ مع مقدمہ وحواشی محمد جہانگیر عالم، لاہور، ۱۹۷۷ء

۵۔ پیش لفظ از قائداعظم۔ **علامہ اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام**

۶۔ مطلوب الحسن سید، **محمد علی جناح**، ایک سیاسی مطالعہ، (انگریزی)

۷۔ ہفتہ روزہ، **حمایت اسلام**، لاہور، ۶ مارچ ۱۹۴۱ء، ۳

۸۔ روزنامہ **انقلاب**، لاہور، ۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء، ۳

۹۔ شورش کاشمیری، **اقبال پیامبر انقلاب**، فیروز سنز، ۱۹۶۸ء؛ احمد سعید، قائداعظم اور اقبال، لاہور، ۷۰، ۷۱